منٹو اور بیدی، تصورِ انسان کے حوالے سے تقابلی جائزہ

The Concept of a Human in Manto and Bedi's Stories;

A Comparative Study

ڈاکٹر روبینہ یاسمین
ایسوسی ایٹ پروفیسر،
گورنمنٹ گریجویٹ کالج فار ویمن، سرگودھا

Abstract;

Man became centre of the universe and philosophy when the term philanthropy and humanism came into existence in the Renaissance. Writers and poets showed reflections of man from different angles in their creations that literature is the commentator/ interpreter of life. Influenced by French and Russian Literature. Urdu fiction writers have presented the mixture of reality, imagination and concept of man through gender and nature's reference. The inner depths of man reveal the secrets of instincts and human passions by nature's blind caves and gender's deep abyss. In this research article two great fiction writers of Urdu language i.e. Saadat Hassan Manto and Rajindar Singh Badi's concept of man has been clarified through comparison of myths

کلیدی الفاظ۔ منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کلیانی، لاجونتی، پریم چند، سانحہ جلیانوالہ

سعادت حسن منٹو نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں محکوم برصغیر میں آنکھ کھولی۔ اُس وقت کلونیل ہندوستان تک مغربی افکار اور روسی انقلاب کے سورج کی کرنیں پہنچ رہی تھیں جن کی روشنی سے غلاموں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ اور آرزو دوچند ہو گئی تھی۔ غلام معاشرے میں انسان نہ صرف انگریز بلکہ اپنی صدیوں کی روایات کا بھی اسیر تھا۔ یہاں انسان کا مقام متعین کرنا تو دور کی بات اُسے انسان سمجھنا بھی کارِ دارد تھا۔ انسان کی آزادی، اُس کی حیثیت، اُس کا مقام خاندان، معاشرے اور کائنات کے تناظر میں طے کرنا ابھی باقی تھا۔ پھر صنفی امتیاز بھی اس معاشرے کی جڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔ برتری کا تصور مرد کے ساتھ بندھا تھا جبکہ عورت صدیوں سے غلام تھی۔ باہر کی دنیا اور گھر کی چار دیواری میں بُعد المشرقین تھا جسے عبور کرنا اُس کمزور صنف کے

بس کا روگ ہر گز نہ تھا مرد کا شمار تو اعلیٰ جنس میں تھا۔ عورت محکوم بھی تھی اور مظلوم بھی جبکہ مرد ظالم بھی تھا مظلوم بھی۔ ظالم وہ چار دیواری کے اندر تھا اور مظلوم چار دیواری سے باہر۔ طبقاتی کشمکش، جاگیر داری نظام، بدیسی حاکموں کا جبر و استبداد گویا چومکھی جنگ میں تھکا ہارا مرد اپنے اعصاب کی تھکن اپنے سے کم تر اور کم زور عورت کا استحصال کر کے اُتارتا تھا۔ منٹو کا خمیر اسی مٹی سے اُٹھا تھا اس کا شعور غلامی اور استحصال کی اسی فضا میں پروان چڑھا۔ منٹو کا احساس اس قدر شدید تھا کہ سات سال کی عمر میں جس "تماشا" یعنی سانحہ جلیانوالہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھا، تمام عمر اُس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا۔ انسان کا وقار و مقام، آزادی کی قدر و قیمت، جبر و استبداد سے نفرت اور استحصال کے خلاف شدید جذبات اُس کے خون میں رچ بس گئے۔ ہر ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانا، اُس کا وطیرہ رہا۔

اس نے عام انسان اور اُس کے مختلف رویوں سے انسانی ردِّ عمل کو دیکھا اور پھر ان جزئیات کو اپنے مخصوص انداز سے افسانوں میں سمو دیا۔ اس زاویۂ نظر کے مختلف روپ جو صرف منٹو کی نگاہوں میں آشکار تھے اُس کے افسانوں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں، اُس نے اپنے افسانوں کی بنیادیں اسی انسانی زاویہ نظر پر استوار کی ہیں، یہی زاویہ نظر زندگی کے حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں مدد کرتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو افسانوں میں بیان کرنا اُس کا فن حقیقت نگاری ہے۔ منٹو کا گہرا شعور ان حقیقتوں کے خدوخال کو افسانوی شکل دے کر ہم تک پہنچاتا ہے تاکہ ہم اپنے ہم جنسوں کی، انسانوں کی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں۔ منٹو کے کردار طوائف، بگڑی ہوئی لڑکیاں، دلال، بدمعاش، غنڈے، بھڑوے سب انسان ہیں۔ منٹو انھیں حقیقی رنگ میں ہمارے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی انسان ہیں ہماری ہی طرح لطیف جذبات رکھنے والے، نرم و نازک احساسات والے، ان کی بھی عزت نفس ہے، ان کی بھی ہتک ہوتی ہے، یہ بھی محبت کر سکتے ہیں، قربانی دے سکتے ہیں، ان کی روح بھی بے داغ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی انسان ہی کے روپ ہیں تو پھر انسانیت سے، نفرت نہیں محبت ہونے لگتی ہے۔ منٹو کے یہاں طوائف سے ہمدردی ہے نفرت نہیں کیونکہ وہ انسان کو فطری طور پر معصوم سمجھتے ہیں کمینہ یا رذیل نہیں۔ اُن کے یہاں انسان بہت اعلیٰ مخلوق ہے جس میں قدرت کے بہت سے راز پنہاں ہیں اور منٹو قدرت کے انھی رازوں سے، انسان کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔

منٹو حقیقت نگار ہے ۔رومانیت کا اُس کے یہاں گزر نہیں۔ اُس کے مزاج میں ہی رومانیت نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ اپنی حساس طبیعت کے باعث منٹو نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنے افسانوں میں سمو دیا۔ وہ محض تخیل کی پرواز کا قائل نہیں وہ زمین پر رہ کر آسمانوں سے رشتہ نہیں جوڑتا نہ ہی فرشتوں کی تخلیق کرتا ہے بلکہ اپنے جیسے زمینی انسانوں کے مختلف روپ ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ اُس کے یہاں حقیقت کا گہرا ادراک اور گہرا شعور ہر جگہ نمایاں ہے۔ اُس کا فن حقیقت نگاری کا فن ہے جس میں زندگی کا شدید احساس اور

انسانوں سے گہری دلچسپی واضح ہے۔ منٹو انسان اور زندگی کو ویسا پیش نہیں کرتا جیسا کہ اُسے ہونا چاہیے بلکہ اُس کا فن زندگی کی تمام تر حقیقتوں سے عبارت ہے۔ منٹو نے روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں سے بھی گہرے اثرات قبول کیے مگر کسی کی تقلید نہیں کی۔ اُسے روسی ادبیات سے دلچسپی بھی صرف اس لیے ہے کہ داستان گوئی کی بجائے "روسی افسانوں اور ڈرامے میں حیاتِ انسانی اور نظامِ عالم کے متعلق غور و فکر کے شواہد پائے جاتے ہیں اور قصے کا موضوعِ بحث عموماً انسان ہوتا ہے۔"[۱]

منٹو کے عہد تک رومانیت پریم چند اور اُن کے ہم عصروں میں نمایاں تھی۔ عصمت چغتائی اور کرشن چندر نے حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھایا مگر رومانیت اُن کے خمیر میں گندھی تھی۔ منٹو نے رومانیت کے بت کو حقیقت نگاری کے گُرز سے کچھ اس طرح پاش پاش کیا کہ رومانیت اور جذباتیت کا اُس کے یہاں گذر ہی نہیں۔ منٹو کا فن ایک طوفان کی سی تُندی اور تیزی رکھتا ہے جس کے اثرات ہر جگہ نمایاں ہیں۔ یہی تیزی اور تندی، لہجے کا تیکھا پن منٹو کی پہچان ہے۔ وہ زندگی کا فنکار ہے اور زندگی میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ اُس کے افسانوں میں عام انسانی مسائل کے ساتھ عمرانی اور سماجی معاملات کا بھی تذکرہ ہے۔ کہیں سیاسی رنگ ہے تو کہیں انسانی فطرت کے مختلف رنگ اُس کے افسانوں میں حقیقت کے رنگ بھرتے ہیں۔ منٹو کے یہاں عورت کو بحیثیت انسان دیکھنے کی آرزو نمایاں ہے۔ معاشرے کے نچلے اور کمزور طبقات کی نمائندہ عورت، طوائف ہے۔ منٹو کے عہد تک آتے آتے اُردو افسانہ ان موضوعات کا متحمل ہو سکتا تھا، جنھیں ایک صدی پہلے تک چھونے سے بھی قلمکاروں کے ہاتھ قلم ہو جاتے۔ منٹو اور اُن کے ہم عصر افسانہ نگاروں نے ادب اور جنس، طوائف، عورت، اُس کے گاہک، عورت کی نفسیات، اُس کا معاشی اور اقتصادی استحصال تک کے مضامین کو افسانوی ادب میں جگہ دی ہے۔ یہ ہم عصر انسانی طرز کے معاشرے کی تشکیل کے خواہاں تھے اور انسان کو معاشرے کے حوالے سے نہیں بلکہ معاشرے کو انسان کے حوالے سے پہچاننا چاہتے تھے۔ گھرانے اور کوٹھے کے فرق کو نمایاں کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کرنے والوں نے عام لوگوں کے ذہن میں عورت کے پرانے تصور کی جگہ نئے تصور، نئے انسان کو جگہ دینے کی کوشش کی۔ یہ فکری رویہ اور اندازِ نظر روایت شکن تھا کہ اس سے پہلے گھر کی عورت اور کوٹھے کی عورت کو الگ الگ خانوں میں رکھا جاتا تھا اور ان دونوں کا تقابل کسی طور بھی ممکن نہ تھا۔ جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> "گھرانہ، طوائف کے کوٹھے سے کئی جذباتی منزلوں کے فاصلے پر آباد تھا، تاہم جس رشتے کے ساتھ عورت گھرانے میں آباد تھی ویسے رشتے طوائف کے کوٹھے پر موجود اور برقرار نہ تھے۔ ایسے تقابلی اندازِ نظر سے یہ سوال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ گھرانے کی عورت اور اُس عورت میں جو کوٹھے پر رہتی ہے کیا فرق ہے؟"[۲]

منٹو عورت کے دامن سے "طوائف" کا داغ دھو دینا چاہتے تھے۔ وہ عورت کو طوائف کی گالی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے اُس کا تجزیہ بحیثیت انسان کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے داغوں اور دھبوں کو سر عام ننگا کرنا حقیقت نگاری کے زمرے میں آتا ہے۔ منٹو نے کرداروں کے پوشیدہ چہروں کو زندگی بلکہ زندگی کی تہہ تک جا کر حقیقت کو سر عام آشکار کیا۔ منافقت کے پردوں کو پیاز کے چھلکے کی طرح ایک ایک کر کے اُتارنا اور دوسروں کو دکھانا کہ اس میں تو کوئی مغز ہی نہیں ہے یہ تو اندر سے خالی ہے۔ یہ انسان ویسا نہیں جیسا نظر آتا ہے اس کا اندروں کچھ اور ہے۔ منٹو نے کرداروں کے جنسی پہلو کو بھی نمایاں کیا۔

منٹو کے عہد میں ایک اور بڑا نام راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ بیدی کا دھیما لہجہ گندھے ہوئے پلاٹ اور زندگی کے دُکھ سکھ کی دھیمی دھیمی آنچ ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ خود بیدی نے اعتراف کیا ہے کہ پہلے وہ سطح آب کے طوفان کو کہانی میں تخیل سے سموتے تھے مگر بعد میں انسان کے تحت الشعور تک جانے کی کوشش کی تو نقادوں نے کہنا شروع کر دیا کہ تم جنس پر لکھتے ہو۔ "صرف ایک سگریٹ" بیدی کا خوبصورت افسانہ ہے۔ یہاں جنس کا تذکرہ بھی صحت مندانہ انداز میں ہے اور حقیقت سے قریب تر۔ بیدی نے پورے گھر کا نقشہ کھینچا ہے جس سے کرداروں کے جذباتی رویے، نفسیاتی کیفیات اور ذہنی الجھنیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ یوں یہ افسانہ زندگی کے پیچ و خم سے آگاہ کرتے ہوئے بڑھاپے اور زندگی کے حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ سنت رام بوڑھا ہو چلا ہے۔ اُس کی بیوی اس عمر میں دھوبن ہو چلی ہے کہ وہ سب کپڑے گھر میں ہی دھوتی ہے اور تھک کر سب سے لڑتی بھی ہے۔ تمام زندگی اُس کی سسرال، خاوند اور بچوں کی خدمت گزاری کرتے گزری ہے۔ اس عمر میں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقاب بھی بس واجبی سے ہیں۔ دھوبن تو جنسی طور پر بوڑھی ہو چلی ہے مگر مرد بوڑھا نہیں ہوتا۔ بیدی نے زندگی کی اس آفاقی سچائی کو اس طرح افسانے میں سمو دیا ہے:

> "سنت رام پر وہ وقت چلا آیا تھا جب کہ جوانی ایک بار پھر عود کر آتی ہے۔ آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے، پہلے کی سی طاقت کے ساتھ شعور اور تجربہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور ایک پختگی اور رسیدگی پا جانے سے انسان خود ہی اپنے آپ میں تعفن پیدا کر لیتا ہے اور تھوڑے پانی والے پوکھر کی کیچ میں بھینس کی طرح لوٹنے لگتا ہے۔"[۳]

دھوبن فطری اور معصوم عورت کا دوسرا روپ ہے، وہ اپنے خاوند کی جنسی ضروریات کو نہیں سمجھتی کہ اس عمر میں بھی اُسے بیوی کا ساتھ چاہیے کہ محبت کرنے والی عورت کا ساتھ مرد کی ضرورت ہے۔ پہلی عمر میں ماں کی ممتا اور جوانی میں بیوی یا محبوبہ اور بڑھاپے میں بھی کسی نہ کسی کا ساتھ ضروری ہے۔

بیدی کا کردار بوڑھا سنت رام انسان کی محبت کی داستان نہیں بلکہ یہ وہ انسان ہے جو زندگی سے موت کی طرف سفر پر گامزن ہے۔ یہاں زندگی اور رشتوں کے بننے اُدھیرنے کا عمل واضح نظر آتا ہے۔ یہ وہ انسان ہیں جنہیں دنیا بوڑھا سمجھتی ہیں۔ مگر ان کے دل میں ابھی جذبات سرد نہیں ہوئے کہ انسان تو جذبات و احساسات کا مجموعہ ہے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے زمانے کے رنگ بدلنے لگتے ہیں بچے بڑے ہو کر والدین کو پرانے زمانے کا سمجھتے ہیں اور اونچ نیچ کا سمجھانے پر برا مانتے ہیں یہاں رشتوں کے درمیان عمر کی خلیج حائل نظر آتی ہے جو عمر رسیدہ انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ جنریشن گیپ ہر نسل سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ آج کے مہذب انسان کے جذبات و احساسات کا تاروپود ہے جو کہانی کے زیریں سفر کرتا ہے اور اس انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو مہذب ہے مگر جذباتی طور پر خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ بیدی نے اپنی بصیرت کو فن کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ذاتی دکھ کو آفاقی رنگ دے دیا ہے ان کے یہاں فرشتے یا شیطان کا تصور نہیں ہے ان کے ہاں انسان اپنی نفسیاتی، جنسی، کمزوریوں کے ساتھ انسان ہے۔

دھوبن نادان ہے گھر گھر ہستی کو ہی سب کچھ سمجھتی ہے۔ خدمت کو ہی محبت جانتی ہے۔ وہ سیدھی سادی نادان عورت یہ بھی نہیں جانتی کہ "جب ہونٹ چرا لیے جائیں تو مرد پر کیا بیت جاتی ہے؟ سنت رام انھی کی تلاش میں رُل کر اُن ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جار کھتے ہیں جن پر سوائے نجاست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔"[۴] یہاں میاں بیوی کی ذہنی تفاوت کے ساتھ ساتھ بیدی نے بڑھاپے کے جنسی اُبال اور بوڑھے آدمیوں کی چاہے جانے کی خواہش، اولاد کو اپنے تقابل سمجھنا جیسے سماجی مسائل کو بھی زندگی کے دھارے میں شامل کیا ہے اور اُن کی عکاسی کی ہے۔ پال نوجوان کردار ہے جسے علم ہی نہیں کہ باپ نے اُس کا ایک سگریٹ اُڑا لیا ہے مگر ماں اور بیٹے کی لڑائی کو اس تناظر میں دیکھ کر سنت رام از خود ہی مفروضہ قائم کر لیتا ہے کہ یہ تو ایک بہانہ تھا۔ وہ پال کا لایا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اُس کے منہ پر دے مارتا ہے اور غصے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے تب کہیں جا کر راز کھلتا ہے کہ بیٹے کے علم میں تو سگریٹ چرانے والی بات تھی ہی نہیں۔ یہاں عام انسانوں کے عام جذبات کے ساتھ بیدی نے جنسی خواہشات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ یہ بھی انسانی جبلت ہے۔ منٹو کے یہاں یہی جبلت اور ہی روپ میں اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ افسانہ "والد صاحب"[۵] کا "توفیق" ریٹائرڈ ڈی ایس پی کا بیٹا ہے۔ والد صاحب آپریشن کے سلسلے میں ہسپتال داخل ہیں توفیق نوجوان ہے اور ہسپتال کی نرس مارگریٹ پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اُسے سینما لے جاتا ہے مارگریٹ بھی اُسے پسند کرتی ہے اور ایک دن توفیق کے ساتھ موٹر میں سیر کے لیے جانے کا وعدہ کر لیتی ہے۔ توفیق بہت خوش ہے پٹرول اور بیئر کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ مقررہ وقت سے پہلے ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ وارڈ میں جا کر کمرے کا دروازہ کھولتا ہے تو "کیا دیکھتا ہے کہ مارگریٹ

پلنگ پر جھکی ہوئی ہے اور والد صاحب۔۔۔ اور والد صاحب اُس کے ہونٹ چوس رہے ہیں۔"[٦] توفی کی والدہ بھی اُس کے ساتھ تھیں توفی تو نظریں نیچی کر کے واپس آ گیا مگر والدہ دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔

منٹو کے ہاں انسان نہ تو دبا ہے نہ سہما ہوا ہے بلکہ فطری انسان اپنے جنسی جذبوں کے ساتھ کھل کر سامنے آتا ہے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور جذبات کا تعلق عمر سے نہیں دل سے ہے توفیق کے والد آپریشن کے بعد ہسپتال میں ہیں زندگی اور صحت یابی کی عملی شکل ایک نرس سے محبت کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

بیدی کے افسانے "لاجونتی" کی لاجو واپس آ گئی ہے۔ عزت بھی ہے مگر عورت نہیں رہی، دیوی بن گئی ہے۔ یہاں بیدی کا آدرشی انسان کا تصور اُبھرتا ہے جبکہ "لاجونتی" کے تقابل پر منٹو کا افسانہ "خدا کی قسم" فطرت نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ منٹو نے انسانی فطرت کی عکاسی کی ہے کہ جوان لڑکیوں کا قدر دان ہے اُسی کے پاس رہیں۔ پاکستان میں اُن کے لیے ریفیوجی کیمپ تھے، لوٹ کھسوٹ کرنے والے گدھ تھے یار یاکار اور منافق، خیرات تقسیم کرنے والے، روح کے زخموں پر پھاہا رکھنے والا کوئی نہ تھا۔

لاجونتی کے تقابل پر افسانہ "خدا کی قسم" میں پگلی کی بیٹی ہے جو مسلمان ہے اور اتنی خوبصورت ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ مگر وہ واپس نہیں آنا چاہتی نہ ماں کے پاس نہ پاکستان، کہ وہ عورت ہے اور خوبصورت ہے، چھیل چھبیلے محبت کرنے والے سکھ خاوند کے ساتھ خوش ہے اور ماں کو دیکھ کر بھی نہیں رکتی بلکہ جلدی چلنے کا کہہ کر نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر غائب ہو جاتی ہے کہ اُسے جو محبت اُس سکھ سے ملی ہے وہ کسی اور کی ہو کر ملنے کی اُمید نہیں اور عورت محبت کی پیاسی ہے جو مرد اُسے محبت اور سکھ دیتا ہے وہ اُس سے بے وفائی نہیں کرتی جب کہ مغویہ ہو کر کیمپوں اور خیموں میں، لوگوں کے دلوں میں اُس کے لیے جگہ کہاں بنتی ہے؟ کون ہے جو ان ٹھکرائی ہوئی روحوں کو سینے سے لگائے۔ منٹو نے عورت کا بحیثیت انسان وہ روپ دکھایا ہے جو عام حالات میں شائد نظر نہ آتا مگر فسادات، ظلم و جبر اور بربریت کا شکار عورتوں کا مستقبل ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اندھیر تھا۔ جو ظلمت اس شبِ تاریک نے اُن کے مقدر کے خانے میں گھول دی تھی۔ کوئی منتر، کوئی وید اُسے روشنی میں بدلنے سے قاصر تھا۔ پھر عورت اپنا بستا گھر چھوڑ کر کس کے سہارے پلٹ آتی، دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر تھا کہ سکھ ہی سہی خوبصورت اور محبت کرنے والا خاوند تو ہے یہاں پھر منٹو کا جنس کی جانب صحت مندانہ رویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ بیدی اور منٹو دونوں نے انسانی نبض پر ہاتھ رکھا ہے مگر دونوں طبیب اپنے اپنے انداز سے مرض کی تشخیص اور علاج کے قائل ہیں۔ منٹو بے رحم جراح کی طرح نشتر زنی کرتا ہے جب کہ بیدی ہلکی خوراک دے کر آہستہ آہستہ مرض کو اندر سے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جنسیاتی مطالعے کے حوالے سے بیدی کا ایک اہم افسانہ "کلیانی" ہے۔ جس میں عورت طوائف ہے کسبی ہے مگر عورت ہے۔ وہ ماں ہے جسم فروشی تو کرتی ہے مگر ممتا کو خود سے الگ نہیں کر پاتی۔ "کلیانی" میں

جنسی معاملات میں بیدی نے کوئی استعارہ استعمال نہیں کیا بلکہ خوب کھل کھیلے ہیں۔ کلیانی میں طوائفیت ہے مگر ممتا بھی ہے۔ وہ مہی پت، کائنات کے مرد کو بھی بچہ سمجھ کر اس کا دکھ سنتی اور سمجھتی ہے مگر عورت عورت ہے اپنی نسوانیت کی توہین برداشت نہیں کرتی۔ وہ دھندا بھی کرتی ہے اور شرماتی بھی ہے بیدی کا کہنا ہے کہ "کون کہتا ہے کہ وہاں عورت عورت نہیں رہتی، وہاں بھی حیا اس کا زیور ہوتا ہے اور حربہ، جس سے وہ مرتی اور مارتی بھی ہے۔"[۷]

"کوکھ جلی" میں بھی بیدی عورت کو ماں کے سوا کوئی اور روپ دینے کو تیار نہیں۔ اُن کے خیال میں دنیا میں ماں کے سوا کوئی عورت نہیں۔ بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے اور بیٹی بھی ماں کی طرح ہی ہے۔ دنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں بیدی نے مرد کی ازلی کمزوری عورت کی محبت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آدم و حوا سے جو محبت شروع ہوئی آدم کے بیٹے آج بھی ہر رنگ میں اسی محبت کو تلاش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ طوائف کی محبت میں بھی جنس کے ساتھ ساتھ نرمی و گداز چاہتے ہیں۔ بیدی دیوی اور بیوی کا فرق ظاہر کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ عورت بھی انسان ہے۔ وہ دیوی نہیں بیوی بن کر مرد کی محبت چاہتی ہے۔ وہ خود دیوی نہیں بننا چاہتی مگر مرد کو دیوتا بنانا چاہتی ہے کہ دیو داسیاں ہمیشہ دل کے مندر میں دیوتا کو ہی پوجتی ہیں بھلے وہ اس کا پتی ہو یا کوئی دوسرا۔ یہ ہندوستانی اساطیر سے مستعار تصور ہمیشہ ہندوستان کی تہذیب اور ادب میں نمایاں ہے اور رہے گا۔ منٹو کی طوائف تو اپنی ہتک برداشت نہیں کرتی۔ ہتک کا ایک لفظ او نہہ اس کی ساری ہستی کی کایا کلپ کر دیتا ہے اور وہ کائنات کے تمام مردوں کی خامیاں اور ان کے تقابل پر عورت کے ظرف کا سوچ کر تمام مردوں سے نفرت کا اظہار صرف مادھو کو کھولی سے نکال کر اس پر نفرت اور حقارت کی نظریں ڈال کر کرتی ہے کہ وہ بھی برابر کی انسان ہے سیٹھ کے پاس دولت ہے تو کیا ہوا وہ تو اسے خریدنے نہیں گئی وہی دولت کے بل بوتے پر اسے خریدنے نکلا تھا، مگر ممتا بیدی اور منٹو دونوں کے یہاں طوائف کے کردار میں اپنا بھرپور اظہار کرتی ہے۔ سو گندھی میں تو پریم کر سکنے کی اہلیت بہت زیادہ ہے جب کہ کلیانی بھی مہی پت کو دوسری کسبی کا کہہ کر بھی یہی توقع کرتی ہے کہ وہ اس کے پاس ہی آئے کیوں کہ عورت فطرتاً مرد پر اپنا قبضہ رکھنا چاہتی ہے اس کی نسوانیت کی مرد کو جھکا کر بھی تسکین نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ممتا کی تسکین قبضے سے ہے اور وہ اس میں کسی دوسرے کی شراکت کی روادار نہیں۔ عورت کے اس پہلو کی آئینہ داری میں منٹو نے ہلاکت کی عورت شاھینہ کو دکھایا ہے کہ وہ خاوند کی بے وفائی کا بدلہ اس کی محبوبہ کی بوٹیاں کر کے لیتی ہے اور خاوند کو کہتی ہے کہ تم اس لیے بچ گئے ہو کہ مجھے تم سے محبت ہے دوسری عورت سے شراکت نہ کر سکنے سے ہی عورت سوتن اور بہو ہر روپ میں اپنے قبضے کے مرد کو دوسری عورت کے ساتھ دیکھ کر اُس کا حسد بیدار ہو جاتا ہے اور پھر عورت کی فطرت اپنا رنگ کئی طرح سے دکھاتی ہے۔

منٹو اور بیدی دونوں نے ہی جنس کا کھلا ذکر اپنے افسانوں میں کیا ہے بلکہ بیدی منٹو سے بھی دو ہاتھ آگے کے جنس نگار ہیں۔ منٹو نے تو جنس کی پرورژن میں جنس کا اظہار کیا ہے یا انسانی فطرت کے اظہار میں جیسے افسانہ "بو" مگر بیدی نے تو دھیمے دھیمے سروں میں جنسی حقیقت نگاری کر کے ایک ایک پرت انسان کی اتار دی ہے۔ منٹو پر تو فحش نگاری کا الزام یار لوگوں کی محبت ہے اور منٹو بدنام ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ منٹو پر مشترکہ ہندوستان میں جس زمانے میں فحاشی کے مقدمے چلے بیدی کا قلم اس وقت محتاط تھا۔ بیدی نے آزادی کے بعد جنسی حقیقت نگاری کی۔ وہ کلیانی ہو یا اندو۔ "اندو" کے سسر ہوں یا سنت رام اور ڈولی۔ ہر رنگ میں زندگی کے اس صحت مند جذبے کا بیان ہے اور کھلے عام ہے۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں مدن کی بیوی اندو مدن سے دور اپنی چھوٹی نند اور دیوروں کے ساتھ بابو جی رام دھنی کے پاس رہنے کو جاتی ہے۔ ساس مر چکی ہے بابو جی رنڈوے ہیں۔ بیدی نے سسر جی کی بہو پر توجہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> "بابو جی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے، اٹھانے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس شلوار کو جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انہیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے ہی کہ نیچے کونے میں نگاہ بہو کے محرم پر جا پڑتی، تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کمرے سے نکل بھاگتے۔۔۔۔ جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔"[۸]

اندو کا مدن کو بتانا کہ ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں" بابو جی کے اندر کے انسان، اس مرد کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بیوی کا دیہانت ہو جانے کے بعد تجرّد کی زندگی گزارتا ہے مگر بہو کو گھر میں دیکھ کر اندر کا مرد بیدار ہونے لگتا ہے تو وہ جلدی سے اسے سلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی فطرت کو معاشرتی قوانین کا پاس بھی ہے ورنہ تو جنس کا گھوڑا بے لگام ہو کر سارے سماجی نظام کو تہس نہس کر دے۔

بیدی کے بابو جی، انسانوں کے وہ روپ ہیں جو قربانی دیتے ہوئے اپنے آپ کو اپنی آرزوؤں کو جیتے جی مار دیتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کے مسخ شدہ روپ ہیں جو اپنے دکھ اپنے ہی سینے میں لیے پھرتے ہیں۔ جگدیش چند رودھاون لکھتے ہیں:

> "اندو کی شلوار کو چھونے کے بعد وہ تائب ہو کر ''اوم نمو بھگوے واسدیوا'' جاپ کر اپنے گناہ کا کفارہ کرنے کی سعی کرتے تھے۔ فطرت کے تقاضوں کی حدّت اور شدت کے سامنے بڑوں بڑوں کے زھد اور پارسائی کے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ انسان نے

صدیوں میں اس قدر کاوش کے بعد تہذیب و تمدن کا جو تانا بانا بنا ہے معاشرے نے اس نظم و ضبط کا جو دستور وضع کیا ہے وہ بہت حد تک انسان کے خط مستقیم سے بھٹکنے میں سدراہ ہے اور وہ لبوں پر مہر سکوت سجائے دل کی دل میں لیے اس جہاں گذراں سے گزر جاتا ہے بابو جی بھی گزر گئے مگر توجہ کی بات یہ ہے کہ مدن سیکس کے معاملے میں باشعور ہے وہ بات سنتے ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔'"[۹]

رنڈاپے اور تجرد سے فطرت کو مسخ کر کے جو ظلم انسان خود پر روا رکھتا ہے منٹو نے اس کا تجزیہ اپنے افسانے " تقی کاتب "[۱۰] میں کیا ہے۔ تقی کاتب کی ماں کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب تقی دو سال کا تھا مگر تقی کے باپ نے دوسری شادی نہ کی خود اس کی پرورش کی۔ خود مجرد کی زندگی گزاری مگر تقی کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اب جبکہ تقی جوان تھا اور اس کو شادی کی بھی ضرورت تھی مگر مولانا اس کی شادی میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ ان کو خود بھی اُس چیز، اس بیماری کی خبر نہ تھی جو ان کے اندر پرورش پا رہی تھی۔ منٹو نے تقی کو کہا کہ تمھارے باپ کا دماغ خراب ہے۔ جب تک ان کا دماغ درست نہیں ہو گا تمھاری شادی نہیں کریں گے۔ ان کے دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو انہوں نے تمھارے لیے کی۔ منٹو نے ایک عام انسان میں اس کے اندر کی اس نفسیات کو پڑھ لیا تھا جو وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ بظاہر تو بیٹے کے لیے اچھی لڑکی کی تلاش شادی میں مانع تھی مگر ان کے دل میں یہ خوف بھی تھا کہ لڑکی بیٹے کو زن مرید نہ بنا لے۔ لوگ ان کے بیٹے کو قابو نہ کر لیں، کوئی ایماندار اور اچھی فیملی ہو۔ مولانا کو بیٹے سے بہت محبت ہے وہ اسے کھونا نہیں چاہتے مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اس عمر میں باپ کی محبت کی بجائے اسے عورت کی، بیوی کی محبت اور توجہ چاہیے اور یہ کہ تقی اب بچہ نہیں پچیس سالہ مرد ہے۔ منٹو نے مولانا کے ان خدشات کے پیچھے چھپے ہوئے محرکات کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ انسانی نفسیات کی ایک ایک گرہ کھول کر رکھ دی ہے۔ منٹو لکھتے ہیں:

"بیوی کی موت کے بعد ایک وقتی جذبہ تھا جس کے تحت مولانا نے تجرد کے دن گزارنے کا تہیہ کیا۔ یہ جذبہ اپنی طبعی موت مرا تو آپ کے لیے دو سوگ ہو گئے ایک بیوی کی موت کا دوسرا اس جذبے کی موت وقت گزرتا گیا اور مولانا نیم کے کریلے بنتے گئے۔۔۔۔ ایک شخص جس نے پچیس برس تک اپنے اور عورت کے درمیان ایک دیوار حائل کر رکھی ہو، وہ کس طرح اپنے جوان بیٹے کے پہلو میں ایک جوان عورت دیکھ سکتا ہے۔ اور وہ بھی نظروں کے بہت قریب۔"[۱۱]

اولاد کی محبت اپنی جگہ مگر انسان بھی خواہشات کا مجموعہ ہے، یہاں وہ فطری انسان سامنے آتا ہے جو معاشرے کے سامنے اپنا قد اونچا کرنے اور بیٹے کی محبت میں مثال بنتے بنتے اپنی فطرت ہی مسخ کر بیٹھتا ہے۔ فطرت مسخ تو ہو جاتی ہے ختم نہیں ہوتی، یہی حال مولانا کا بھی ہے ان کے اندر کا مرد اس تجرد کے خلاف اپنے

انداز سے بغاوت کرتا ہے کہ وہ گھر میں عورت کو برداشت نہ کر سکیں گے، وہ عورت کے بغیر اور بیٹا کے پہلو میں خوبصورت اور جوان عورت ہو وہ تقی کی شادی کو ٹالتے رہتے ہیں، بادل نخواستہ جب شادی ہو جاتی ہے تو ان کے اندر کا مرد جاگ جاتا ہے اور عورت کو دیکھ کر مختلف طریقوں سے اپنے ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ فطرت پر بندھے بند کھلنے لگتے ہیں اور بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ غسل خانے کی درزوں سے بہو کی تاکا جھاکی کرنے لگتے ہیں۔

منٹو نے انسان کی فطرت کا پوشیدہ بھید کس سادگی سے بیان کر دیا ہے کہ انسان اپنے مقام پہ ہی ٹھیک ہے اسے فرشتہ بننے کی ضرورت نہیں اور یہ تجرد، یہ جوگ، یہ سنیاس سب انسانی فطرت کو مسخ کرتے ہیں انسان اپنی فطرت کے ساتھ ہی جچتا ہے۔ تقی کے والد تقی کی شادی کے بعد بیٹے کو عورت سے دور رکھنے کی کوشش کرتے اور عجیب و غریب حرکتیں کرتے۔ آخر بیٹا بہولے کر گھر سے چلا جاتا ہے اور باپ کو خط لکھ کر اپنی خیریت کی اطلاع یوں دیتا ہے کہ میں یہاں خیریت سے ہوں آپ نے میرا گھر آباد کیا ہے میری خواہش ہے کہ آپ بھی اپنا گھر آباد کر لیں۔ بات مولانا کے دل کو لگتی ہے کہ وہ تو تقی کے لیے دنیا کو تیاگ چکے تھے جب اس نے ہی یہ مشورہ دیا ہے تو انہوں نے فوراً ایک عورت سے اپنی بات پکی کر لی۔

منٹو نے افسانے کو فطری اور منطقی انجام تک پہنچا دیا ہے جبکہ بیدی "بابو جی" کو دل کے دورے سے ختم کر کے ان کی حسرتوں کو بھی ساتھ ہی دفن کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت بیان کی محتاج نہیں کہ مرد کو عمر کے ہر حصے میں عورت کی ضرورت رہتی ہے اور اُس کی نسائیت اور لطافت مردانہ کھردرے جذبات والے مردوں کو بھی رام کر لیتی ہے کہ مرد کی کمزوری عورت اور اس کی نسوانیت ہے۔ منٹو نے جنس ہی نہیں زندگی کے معاشی اور معاشرتی تضاد کی تاروں کو بھی چھوا ہے کیونکہ وہ انسانیت سے محبت کرتے ہیں۔

بیدی نے آخری دور میں انسانی فطرت کے نفسیاتی پیچ و خم اور زندگی کی خوشی اور غم سے افسانوں کا تانا بانا بُنا ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ بیدی کا مشاہدہ بھی گہرا مگر انداز دھیما ہے جبکہ منٹو دبنگ آواز ہے جو پورے معاشرے کو چونکا دیتی ہے کیوں کہ منٹو کے ہاں زندگی کا تجربہ ہے۔ ان کی خود اعتمادی زندگی کے وسیع تجربہ کا نتیجہ ہے۔ انیس ناگی کے خیال میں "منٹو کو احساس تھا کہ بیدی ہی افسانے میں اس کا اصل حریف ہے کیوں کہ بیدی منٹو کی تنقید سے محفوظ رہا۔"[۱۲]

منٹو اور بیدی کے درمیان نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے۔ ورنہ موضوع تو بیدی نے بھی زندگی کی حرارت سے ہی لیے ہیں کہانیوں کے کردار بھی زندگی کے پہاڑ سے محنت کر کے صنم تراش کی طرح نکالے ہیں لیکن بیدی کے ہاں فنی اظہار میں تخیل کی اڑان اور روح کی وسعت بھی ہے۔ بیدی انسانی رشتوں کے پاس اور تحفظ کا قائل ہے جبکہ منٹو کے کردار باغی اور زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ منٹو نے رشتوں کے تقدس

کے پیچھے چھپے انسانی لالچ اور ہوس کو بے نقاب کر دیا ہے۔ "کتاب کا خلاصہ "کی بملا کی زندگی انسانی رشتوں اور اقدار کے منہ پر زبردست طمانچہ ہے۔ منٹو آسمان کی وسعتوں سے زیادہ زمین پر بسنے والے انسان کو اہمیت دیتا ہے اس کے مختلف روپ، سوچ، ریاکاری اور اخلاص پر نظر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر تخلیق کار انفرادی حیثیت کا مالک ہے اور اپنا منفرد انداز رکھتا ہے۔ انسانی رویوں، انسانی رشتوں، انسانی جبلتوں کے جو نمونے ہمیں منٹو کے یہاں ملتے ہیں وہ تھوڑے بہت تو ہر تخلیق کار کے یہاں ہیں مگر سب خوبیاں جب یکجا ہو کر سامنے آتی ہیں تو وہ منٹو کی تخلیقات ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کے پیچیدہ پرت ایک ایک کر کے علیحدہ کیے ہیں۔ وہ کرداروں کو تخلیق کرتے ہیں تو اُن کی روح میں چھپی تنہائیوں کے کرب اور دُکھ کے الاؤ تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ پھر اُس الاؤ کی راکھ سے انسانی سرشت کی چنگاری نکال کر دکھاتے ہیں کہ انسان حقیر اور ذلیل نہیں، بڑی پائے کی چیز ہے اُس کی انسانیت اُس کی روح میں پنہاں ہے اور روح کی گہرائی تک رسائی ہر فنکار کے بس کا روگ نہیں۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ منٹو، سعادت حسن، کلیاتِ منٹو، منٹو کے مضامین، (لاہور: پاکستان ٹائمز پریس، نومبر ۱۹۶۶ء) ص: 481

۲۔ غلام زہرا، مرتب: منٹو کیا تھا؟، (لاہور: برائٹ بکس، ۲۰۱۳ء)، ص: 405

۳۔ بیدی، راجندر سنگھ، مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء)، ص: 659

۴۔ ایضاً، ص: 659

۵۔ منٹو، سعادت حسن، بادشاہت کا خاتمہ، (لاہور: مکتبہ اُردو، ۱۹۵۱ء)، ص: 53

۶۔ ایضاً، ص: 68

۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، مرتب: راجندر سنگھ بیدی کی پندرہ کہانیاں، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۰ء)، ص: 271

۸۔ راجندر سنگھ بیدی، مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، ص: 508

۹۔ جگدیش چندر ودھاون، راجندر سنگھ بیدی (فن اور شخصیت)، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء)، ص: 270

۱۰۔ منٹو سعادت حسن، بادشاہت کا خاتمہ، ص: 31

۱۱۔ ایضاً، ص: 31

۱۲۔ انیس ناگی، سعادت حسن منٹو، (فلم اسکرپٹ)، (لاہور: مکتبہ جمالیات، ۱۹۹۰ء)، ص: 25